# ۱

باہم سبحانہٗ کہ سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں کہ جس نے ایک لفظ کن کہہ کر یہ کون و مکاں پیدا کئے اور زمین و آسمان بنائے اور کیا خوب بنائے کہ آسمان کے پھیلاؤ میں ستارے بھر دیئے، بیچ میں ان کے چاند سورج رکھ دیئے، اور گود زمین کی ندیوں نہروں تال تلیوں سے بھر دی کہ فیض سے ان کے باغ بغیچے پھولے اور کھیت لہلہائے۔ باغوں کو رنگ رنگ کے پھلوں سے مالا مال کیا کہ انہیں پھلوں میں وہ پھل بھی ہے۔ جسے آم کہتے ہیں اور جس کی ایک قسم صرف ہمارے جدی باغ میں پائی جاتی تھی کہ جسے ایک دفعہ جو شخص چکھ لیتا ذائقہ اس کا نہ بھولتا، تا عمر ہونٹ چاٹتا رہتا۔ میوہ جات مستزاد مثل بادام کشمکش اخروٹ و نیز پستہ جس کی ہوائیوں سے فیرنی کی طشتریوں پر بہار آتی ہے۔ کھیتوں کا دامن سبزی ترکاری سے بھر دیا اور گندم موٹھ مٹر جیسی اجناس سے۔ انہیں کھیتوں کے بیچ ایک ہنستا ہوا کھیت زعفران کا کھلایا کہ بریانی کی جان ہے، قورمے کی آن ہے۔ تو ایسا عالم ظاہر کیا اور اس عالم کے بیچ بھانت بھانت کا جانور اور رنگ رنگ کی مخلوق پیدا کی کہ اسی میں انسان ضعیف البنیان بھی ہے۔ سبحان تیری قدرت کہ تو نے اسی بودی بنیاد والے جانور کو اشرف المخلوقات ٹھہرا دیا۔ اس لطیفۂ غیبی پر عقل دنگ ہے، زبان گنگ ہے۔ لطف و کرم اس کے

کس زبان سے شکر ادا کیا جائے کہ اس ظالم و جاہل مخلوق کی اصلاح کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ عزیزو، پھر بھی کم بھیجے کہ اس دو رنگی مخلوق کا ظلم زیادہ ہے، جہل بے اندازہ ہے۔

انہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہمارے پیارے نبی رحمت اللعالمین خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ آپ اور آپ کی آلِ اطہار اور اصحاب کبار پر بعد درود وصلوٰۃ کے بندۂ ہیچمقدار مشتاق علی ولد حکیم چراغ علی غایت اس تذکرے کی بیان کرتا ہے جو یوں ہے کہ ایک شب خواب میں ابا جانی کو دیکھا کہ سامنے دھرے اوراقِ پریشاں کو دیکھ کر پریشان ہیں اور افسوس کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ بزرگوں نے اپنے اپنے وقت میں حق ادا کیا، ہم سے حق ادا نہ ہوا۔ بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے پریشان ہوا کہ یہ کیسا خواب تھا۔ بعد تامل کے اسے حرفِ تنبیہ جانا۔ خود کو نفرین کی کہ اے سگِ دنیا مشتاق علی اللہ تعالیٰ تیرے حال پہ رحم کرے۔ تو نے عمر لہو و لعب میں، سیر و شکار میں گذار دی۔ ہنوز تو علائق دنیوی میں مبتلا ہے۔ ہر چند کہ سر تیرا چاندی ہو چکا ہے اور عمارت تن کی تیرے ہل چکی ہے پر حرص و طمع تجھے نہیں چھوڑتی۔ اے غافل اب جبکہ تو گور کنارے آن لگا ہے اور پتہ نہیں کہ پیکِ اجل کب پیام لے کر آجائے خوابِ غفلت سے جاگ اور اپنے فریضہ کو پہچان۔ جان لے کہ خواب میں ابا جانی کا آنا اور اوراق پریشان کو دیکھ کر افسوس کرنا تیرے لئے ایک اشارہ ہے۔

تب میں نے ابا جانی کے بکھرے ورق اکٹھے کئے اور دل پہ دھر لیا کہ اس خاندانی تذکرے میں بعد کے خاندانی حالات اضافہ کر کے و نیز حالاتِ زمانہ قلمبند کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچاؤں گا۔ بعد میں اخلاف اس میں اضافے کرتے رہیں گے۔ نیز طے کیا کہ یہ کام شتابی سے انجام دیا چاہیئے کہ ایک تو عمر کوتاہ ہے۔ دوسرے زمانہ پُر آشوب ہے۔ ستیزِ بیجا کا نقشہ ہے۔ طرابلس میں برادرانِ اسلام پر قیامت گزر گئی۔ ترکی میں خلافت کا تختہ اُلٹ گیا۔ امرتسر میں فرنگیوں نے اپنی دیسی رعایا کو بھون ڈالا۔ دم کے دم میں جلیانوالہ باغ مقتل بن گیا۔ دیارِ ہند کی خلقت تراہ تراہ پکار اٹھی۔ گاندھی جی نے ایسی ستیہ گرہ کی کہ نگر نگر میں قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ چور اچوری

میں تو ایسا ہوا کہ خلافتیوں اور کانگریسیوں نے تھانے ہی کو پھونک ڈالا کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، قصہ مختصر زیرِ آسمان وہ ہوا اور ہو رہا ہے کہ چشمِ فلک نے کبھی کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ ابھی آگے دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے۔ زمانہ بے اعتبار ہے۔ چرخِ کج رفتار ہے۔ گھڑی گھڑی رنگ بدلتا ہے۔ سنگِ حوادث سے ایسا تفرقہ پیدا کرتا ہے کہ دوست دشمن بن جاتے ہیں۔ ابھی چاہت میں مرے جا رہے تھے ابھی خون کے پیاسے ہیں۔ علی برادران کو دیکھو کل تک گاندھی جی سے دانت کاٹی روٹی تھی تو من شدی من تو شدم کا مضمون تھا۔ ارے اس مہاتما کی خاطر تو ان مولاناؤں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ بی اماں گوشت کی ہنڈیا پکانے سے گئیں۔ دال ترکاری گھوٹ گھوٹ کے بیٹوں کو کھلانے لگیں۔ غضب خدا کا مسلمان گھر کا باورچی خانہ گوشت کی ہنڈیا کی مہک سے محروم ہو جائے۔ مگر اب گاندھی جی سے ان کی ٹھنی ہے۔ وہ مہاتما میسنا ہے۔ یہ بھائی بھڑ بھڑیا ہیں۔ گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں۔ کل مہاتما جی پہ جان چھڑک رہے تھے۔ اب بے نقط سنا رہے ہیں، آگ کے انگارے اگل رہے ہیں۔ ادھر ہندو مسلمان کٹے مر رہے ہیں۔ ملتان مقتل بن گیا۔ مٹی اس دیار کی خون سے رنگین ہوگئی۔ برادرِ خورد اشتیاق علی بی اے نے بیان کیا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان کوائف معلوم کرنے کے لئے اس قرئیے میں گئے۔ ایک کوچے سے گذر ہوا تو کیا دیکھا کہ ایک بوڑھیا ایک جلا پھینکا پنجرا گود میں لئے جلے ملبہ پہ بیٹھی گریہ کرتی ہے۔ حکیم صاحب قبلہ نے احوال پوچھا تو اس نے رو رو کے دہائی دی کہ ناس پیٹوں نے میرے گھر کو پھونکا سو پھونکا میرے مٹھو کو بھی نہ چھوڑا۔ پنجرا آگ میں جھونک دیا۔ پھر جلے پنجرے کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ادھر حکیم صاحب قبلہ بھی آبدیدہ ہوگئے۔

برادرِ خورد اشتیاق علی جوشِ جوانی میں تحریکِ خلافت میں شامل ہوگئے تھے۔ فقیر نے انہیں بہت روکا ٹوکا سمجھایا کہ حاکمِ وقت سے سرکشی کرنا قرینِ مصلحت نہیں اور ہمیں تو ان کے مقابل آنا یوں بھی بھلا نہیں لگتا کہ اب ہمارے خاندان کا شمار ان کے وفاداروں میں

ہوتا ہے۔ آگے جو ہوا سو ہوا پر اب تو ہم برکاتِ سلطنتِ انگلیسیہ کے مدح خواں ہیں۔ کیوں نہ ہوں کہ راج میں ان کے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں اور دیار و امصار میں ایسا امن چین ہے کہ چاہو تو کوچہ و بازار میں چاہو تو جنگل ویرانے میں سونا اچھالتے چلے جاؤ، مجال ہے کہ کوئی پوچھ لے کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں اور ہمارے خاندان کا اقبال تو انہیں کے چشمِ کرم کا مرہونِ منت ہے۔ اس بے مقدرت کو انہوں نے خان بہادری کے خطاب سے نوازا اور آنریری مجسٹریٹی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا کہ دادخواہ روز اس ڈیوڑھی پر حاضری دیتے ہیں اور انصاف لے کر جاتے ہیں۔ بدخواہ ہمیں بدنام کرتے ہیں کہ وطنِ عزیز سے غداری کے صلہ میں یہ مراتب ہمیں ملے ہیں۔ حاسد تو ہمارے اقبال کو دیکھ کر آتشِ حسد میں جلتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ فرنگی حاکموں نے ہمارے خاندان کے جرمِ بغاوت کو بخش کر ہمارے دل خرید لئے۔ یہی تو اس فقیر نے میاں اشتیاق علی سے کہا کہ برادرِ عزیز ہمارے ایک بزرگ نے سر اٹھایا تھا تو کتنے دنوں خاندان پر ادبار کی گھٹا چھائی رہی اور خطا ایک مرتبہ ہی معاف ہوتی ہے۔ روز روز تو کوئی بھی حاکم جرم سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ مگر برادرِ عزیز کے خون میں گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک نہ سنی۔ خاندان کی روایاتِ نمک حلالی کو ٹھوکر ماری اور علی برادران کے پیچھے لگ لئے۔ مگر پیچھے ان کے لگ کر کیا پایا۔ حاکمِ وقت کی نظروں سے بھی گرے اور جس مقصد کے لئے یہ طور پکڑا تھا، وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ جگ ہنسائی کے سوا کیا پایا۔ خلافت ہی کا تیا پانچا ہو گیا اور خود اپنوں کے ہاتھوں غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اس کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔ جب یہ خبرِ وحشت اثر یہاں پہنچی تو مت پوچھو کہ اشتیاق میاں پر کیا عالم گذرا۔ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ لگتا تھا کہ خدانخواستہ ہمارے گھر میں کوئی موت ہو گئی ہے۔ میں نے سمجھایا کہ برادرِ عزیز خلافت تو اب جسدِ بے روح تھی اور گھر میں میت کا زیادہ دیر رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ جنازہ نکل گیا، مناسب ہوا۔

علی برادران خلافت کے قضیئے سے فارغ ہوئے تو نجدیوں کے پیچھے لگ لئے۔ ان بھائیوں

کو بھی کوئی نہ کوئی شغل چاہیے۔ جذبات کا ان کے یہاں وفور ہے۔ ندی ہر دم چڑھی ہی رہتی ہے۔ یہ بھائی لوگ ان کے بھرے میں آ گئے کہ سرزمینِ عرب پر جمہوریۂ عربیہ اسلامیہ قائم ہوگی۔ ان کے بندۂ بے دام بن گئے۔ مگر ہوا کیا۔ ادھر انہوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، ادھر یہ بھائی بھیگے بتاشوں کی طرح بیٹھ گئے۔

تو یہ حال ہے مسلمانوں کا اور یہ چال ہے زمانے کی تباہی کے اخبار ہیں۔ قیامت کے آثار ہیں۔ ایک واقعہ عجب گذرا۔ سدّو کا بیٹا ممدو رات گئے زمینوں سے واپس آ رہا تھا۔ دروغ برگردنِ راوی، آ کر سنایا کہ خان بہادر صاب ہوا یوں کہ میں بیٹا بیٹا چلا آ رہا تھا کہ پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ ایسے لگا جی کہ جیسے کوئی جنا لمبے ڈگ بھرتا ہوا پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھنے لگا تھا کہ ایک آدمی ٹانگیں یہ لمبی لمبی جیسے اونٹ کی ہوں، ہاتھ میں لمبا سا لٹھ لمبے ڈگ بھرتا برابر سے سن گزر گیا اور ادھر گذرا ادھر غائب۔ راقم الحروف نے یہ سن کر تامل کیا۔ پھر پوچھا کہ ارے ممدو، تو نے اچھی طرح دیکھا بھی تھا۔ بولا، خان بہادر صاب جی جو جھوٹ بولے سو کافر۔ آنکھوں دیکھی کہتا ہوں اور وہم تو میں نے کبھی کیا ہی نہیں۔ راتیں جنگلوں میں گذاری ہیں۔ کبھی جو وہم کیا ہو۔ میں نے پوچھا، وہ آدمی لگتا تھا نا۔ بولا، آدمی لگتا بھی تھا اور نہیں بھی لگتا تھا۔ میں نے کہا کہ ارے کمبخت، یہ تو نے کیا دیکھ لیا۔ کہیں دابۃ الارض تو نمودار نہیں ہو گیا۔ نشانیاں تو کچھ اسی کی سی ہیں۔

یہ واقعہ سننے کے بعد مجھے کئی دن تک تشویش رہی۔ ممدو کی پیشانی تو میں نے اسی گھڑی غور سے دیکھ لی تھی۔ بعد اس کے دوسروں کی پیشانیاں بھی غور سے دیکھیں۔ جب داغ کسی پیشانی پر دکھائی نہ دیا تو دل کو قدرے قرار آیا۔ پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھایا کہ دابۃ الارض ہوتا تو اتنی دیر کہاں لگنی تھی۔ سب پیشانیاں اب تک داغدار ہو تیں، اور دنیا زیر و زبر ہو چکی ہوتی۔ قیامت نامے سے رجوع کیا۔ وہاں سے بھی میرے خیالِ ناقص کی تصدیق ہوئی۔ دابۃ الارض یوں تھوڑا ہی نمودار ہو جائے گا۔ صفا کا پہاڑ جب شق ہو گا——

تب اس کے بیچ سے برآمد ہوگا۔ سات جانوروں کی اس میں شباہت ہوگی۔ ٹانگیں اونٹ والی گردن پہ ایال گھوڑے والے۔ ہاتھ میں عصا۔ اس عصا کے ساتھ دروازوں پر دستک دے گا۔ وہ جو گھروں میں بند بیٹھے ہوں گے بدحواس ہو کر گھروں سے نکل پڑیں گے۔ دابتہ الارض ہر پیشانی کو عصا سے چھوئے گا۔ جس پیشانی کو چھوئے گا وہ داغدار نظر آئے گی۔ بعد اس کے قیامت کو آیا سمجھو۔

جب تحقیق ہو گیا کہ رات کے ہنگام کسی گھر پہ دستک نہیں ہوئی ہے اور کسی پیشانی پہ داغ نہیں ہے۔ تب یہ کوتاہ اندیش مطمئن ہو بیٹھا۔ مگر سوچتا ہوں کہ یہ اطمینان آخر کب تک۔ قربِ قیامت کے آثار ظاہر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دابتہ الارض آج نہیں تو کل نمودار ہو جائے گا۔ ہماری پیشانیوں کو کسی نہ کسی دن داغدار ہونا ہے۔ یہ عاصی پر معاصی آنے والے وقت سے ڈرتا ہے اور توبہ و استغفار کرتا رہتا ہے کہ اے پالنے والے پیشانی داغدار ہونے سے پہلے اس گنہگار کو اٹھا لے۔

پنڈت گنگا دت المتخلص بہ مہجور آتے ہیں تو اپنی کتھا لے بیٹھتے ہیں۔ شری مشتاق علی کلجگ ہے کلجگ۔ میں نے جل کر کہا کہ پنڈت یہ تمہارا کلجگ تو ہماری چودھویں صدی سے بھی زیادہ طول پکڑ گیا۔ آخر کب سے چل رہا ہے۔ بولے کہ جس سمے شیش ناگ جی حضرت بلدیو جی کے منہ سے نکل کر سمدر میں اتر گئے اور حضرت سری کرشن مہاراج کا طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا اور انہوں نے مانس دیہی چھوڑ دی بس اسی سمے سے کلجگ شروع ہو گیا۔ میں نے کہا کہ پنڈت یہ تمہارا کلجگ ہے یا شیطان کی آنت ہے بولے بس شیطان کی آنت کا انت ہونے لگا ہے۔ پنڈت آخر یہ انت کب ہوگا۔ مشتاق علی جی، بس ایک یدھ پڑے گا اور ادھک اتھل پتھل ہوگی۔

جنگِ عظیم جس میں سب نشٹ اور نابود ہو جائے گا۔ ترتایگ کا بھی تو ایسے ہی انت اور انجام ہوا تھا۔ کورو کشیتر میں کتنا کشت و خون ہوا تھا۔ آخر میں کل ملا کر نو جنے بچے

تھے۔ تین کورو پانچ پانڈو اور ایک ہمارے حضرت کرشن مہاراج علیہ السلام۔ پنڈت تمہاری مہابھارت تو جنگ عظیم سے بھی بڑھ گئی۔ واہ مشتاق علی جی، جنگِ عظیم بھی کوئی جنگ تھی۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمہاری جنگ عظیم میں برہم بان کس کے پاس تھا۔ شری مشتاق علی جی پتہ ہے۔ انت میں کیا ہوا۔ اس دشٹ اسوتھاماں نے اپنا برہم بان نکالا اور ایک گھاس کی پتی میں اسے پھونک کر ارجن مہاراج کی اور پھینکا۔ فخر شجاعانِ آریہ ورت ارجن مہاراج نے بھی اپنا برہم بان جلایا۔ تب ویاس جی رشیوں منیوں کو سنگ لے کے بیچ میں آن کھڑے ہوئے۔ چلائے کہ پترو، بان واپس لے لو، نہیں تو۔ یہ سارا برہمانڈ جل کے خاکستر ہو جائے گا۔ مولا ارجن نے تو ترنت ہی حضرت ویاس جی کے چرن چھوئے اور بان واپس لے لیا۔ پر دشٹ استوتھاماں حضرت کا کلام سن کر طرح دے گیا۔ بولا کہ بان واپس لینا میرے بس میں نہیں۔ ہاں یہ اس کی بدل سکتا ہوں۔ اس شقی نے سمت بان کی اس طور بدلی کہ بان پانڈوؤں کی استریوں کی کوکھ پہ جا کے گرا۔ اثر سے اس کے پانڈوؤں کی ازواجِ مطہرات کے گربھ گر گئے، بچے پیٹ میں مر گئے۔

میں نے یہ قصۂ طولانی سن کر کہا کہ پنڈت کورو پانڈو تو چشم و چراغ ایک ہی خاندان کے تھے کوئی بھوت ان پر سوار تھا کہ ایک دوسرے کا خون بہانے پہ تل گئے۔ کوئی انہیں سمجھانے والا نہ تھا۔ مہجور نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ کہنے لگا کہ یہی سوال جنمی جیئے نے حضرت ویاس سے کیا تھا۔ ہوا یوں کہ حضرت گھومتے پھرتے ایک دن دربار میں اس کے آن براجے۔ جنمی جیئے نے حضرت کے چرن پوتر جل سے چاندی کے باسن میں دھوئے پھر یوں گویا ہوا کہ رشی مہاراج، میرے دادا پردادا تو بہت بدھیمان تھے اور پھر دونوں ہی طرف گتی گیانی براجتے تھے۔ بڑے اچرج کی بات ہے کہ ان کی بدھی میں یہ بات نہیں آئی کہ یدھ پڑے گا تو راجہ پرجا کا کتنا ناش ہوگا۔ حضرت افسردہ ہو کر بولے کہ پتر تو نے ٹھیک کہا پر ایسے سمے آتے ہیں۔ بدھیمانوں کی بھی مت ماری جاتی

ہے اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔

یہ کلام سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ کہا کہ پنڈت ٹھیک کہا تمہارے ویاس جی نے۔ آج کل بھی تو یہی احوال ہے۔ غور کا مقام ہے کہ مہاتما گاندھی مولانا شوکت علی کو اس نیت سے ہمراہ کوہاٹ لے گئے تھے کہ دونوں مل کر ہندو مسلمانوں کو ٹھنڈا کریں۔ لے لو وہ تو وہاں جا کر خود ہی آگ بگولا ہو گئے۔ دونوں میں ٹھن گئی۔ مجھے ان جھگڑوں کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ پنڈت اِن بدھیمانوں کو کچھ عقل سکھاؤ۔ کچھ سمجھاؤ۔

پنڈت گنگا دت چپ ہو گئے۔ تامل کر کے بولے کہ مشتاق علی جی، حضرت سری کرشن مہاراج اور حضرت بھیشم پتامہ نے فریقین کو کتنا سمجھایا۔ کوئی سمجھا؟ جب ان ستیوں کا کہا کسی نے نہ مانا تو ہم تم کس کھیت کی مولی ہیں۔ مشتاق علی جی، بس چپ ہی ہو رہو۔ یہ زمانہ بولنے کا نہیں ہے۔

المختصر یہی آشوب زمانہ دیکھ کر فقیر نے سوچا کہ ابا جانی خواب میں بر وقت آئے از بسکہ چرخ کج رفتار ہے اور بے زمانہ بے ثبات ہے، سو اس سے پہلے کہ زمانہ آنکھیں پھیرے اور رشتہ حیات منقطع ہو جائے تو ہاتھ میں خامہ پکڑ اور بعد حمد و نعت کے اور ساتھ درود و سلام کے جاری ہو۔ حالات خاندان و نیز حالاتِ زمانہ بے کم و کاست قلمبند کر۔ مگر اختصار کو ملحوظ رکھ کر رسالہ لمبا نہ ہو جائے اور طبیعت پڑھنے والے کی ملول نہ ہو۔ جاننا چاہیئے کہ کلام میں طوالت خص کے نزدیک ایک عیب ہے اور اہلِ ذوق کے لئے ——— باعثِ گرانیِ طبع اور ——— موجب ملال

——— و نیز ———

آگے کی عبارت باوجود کوشش کے پڑھی نہ جا سکی۔ کچھ ورق بوسیدہ کچھ خط شکستہ یہ پلندا میاں جان کا مخطوطہ تھا یعنی میرے دادا مرحوم کا جنہیں خاندان میں سب چھوٹے بڑے میاں جان اور باہر والے خان بہادر صاحب کہتے تھے سوائے ان کے یار غار پنڈت

گنگا دت مجبور کے جو انہیں کبھی شری مشتاق علی اور کبھی مشتاق علی جی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ مخطوطہ برآمد ہو کر میرے لئے ایک اچھی خاصی آزمائش بن گیا۔ ایک تو ورق بے ترتیب تھے اور بہت بوسیدہ ہو گئے تھے۔ پھر میاں جان کا جناتی خط اُردو بھی ایسی لکھی تھی کہ اس کا لہجہ میرے لئے ذرا اجنبی تھا۔ بہرحال تھوڑا پڑھنے کے بعد میری اس میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ سوچا کہ جب یہ ورق ہاتھ پڑ ہی گئے ہیں تو پڑھ کر دیکھنا تو چاہیئے کہ ان میں لکھا کیا ہے۔ پتہ تو چلے کہ آخر اس خاندان میں ایسی کونسی صفت تھی کہ ہر نسل میں کوئی بزرگ قلم دوات لے کر بیٹھ جاتا اور رواں ہو جاتا۔ کس انہماک کے ساتھ خاندانی حالات قلمبند کرتا اور پچھلے تذکرے کے ساتھ شامل کر کے اولاد کے لئے ایک قیمتی اثاثے کے طور پر چھوڑ جاتا۔ آخر میرے دادا پردادا مال و متاع چھوڑ کر بھی تو جاتے تھے۔ مگر وصیت ناموں میں جتنی تاکید ان پلندوں کے بارے میں ہے "اتنی جائداد کے بارے میں نہیں ہے۔

مجھے خیال آیا کہ آخر میں بھی انہیں بزرگوں کا خون ہوں، میرے یہاں خاندان کا تذکرہ لکھنے کی خواہش کیوں نہیں پائی جاتی۔ میں نے اپنے والد کے یہاں بھی ایسی کوئی خواہش نہیں دیکھی۔ انہوں نے بس اسی قدر کیا کہ بزرگوں کے لکھے ہوئے اوراق کو ضائع نہیں ہونے دیا ویسے انہوں نے اس سلسلہ میں مجھے کوئی ہدایت کوئی تاکید نہیں کی تھی۔ بلکہ میرے سامنے کبھی ان اوراق کا ذکر بھی نہیں کیا۔ وہ تو یہ کہئے کہ نئے مکان میں منتقلی کی تیاری میں سامان کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے خیال آ گیا کہ والد مرحوم کے کاغذات کو ذرا کرید لیا جائے کہ جو ضروری ہیں انہیں سنگھوا لیا جائے اور جو فالتو ہیں انہیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔ بس اس چھان پھٹک میں یہ مسودہ نکل آیا جس کے ورق الگ الگ تھے اور بہت خستہ و بوسیدہ تھوڑے دن اور اسی طرح بند پڑے رہتے تو دیمک کی غذا بن جاتے۔

میرے والد نے اگر تذکرہ نہیں لکھا تو اس کی وجہ تو سمجھ میں آ گئی۔ میاں جان کے

بعد وہ جئے ہی کتنے دن۔ باپ کے جیتے جی انہیں یہ فریضہ ادا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی۔ مگر میرے یہاں یہ خواہش کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے بڑوں کی آنکھیں دیکھیں اور ان کی آنکھ بند ہوتے بھی دیکھی۔ میاں جان کا جنازہ اُٹھتے دیکھا۔ پھر والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھتے دیکھا۔ والد صاحب بس یہاں آتے ہی سدھار گئے۔ جیسے اسی کام کے لئے انہوں نے ان پر آشوب دنوں میں ہجرت کی زحمت اُٹھائی ہو اور جیسے اسی خاطر اس نئی زمین نے انہیں بلوا بھیجا ہو اِدھر آئے اور اُدھر گئے اور اِدھر تو والد گئے۔ اُدھر چچا جان جنہوں نے علی گڑھ میں ڈیرا کر لیا تھا مہینوں میں چٹ پٹ ہو گئے۔ اب ان بزرگوں کو گندرے ہوئے پورا ایک زمانہ ہو چکا تھا اور اب خود میں بزرگ ہو چلا تھا یا یوں سمجھئے کہ بزرگوں کی موت نے مجھے بزرگ بنا دیا تھا۔ مگر اس صورت میں بھی میرے یہاں خاندان کا تذکرہ لکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی، حالانکہ ہجرت کے عمل میں اس خاندان کو جیسے دن دیکھنے پڑے تھے ان کی وجہ سے وہ ایک تذکرے کا مستحق تو تھا۔

اگر اجداد کی وضع کے خلاف میرے یہاں خاندانی حالات قلمبند کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی تو میری سمجھ میں اس کی وجہ یہی آئی کہ میں ایک اکھڑا بکھڑا آدمی ہوں۔ وہ اطمینان جو میاں جان کو میسر تھا وہ مجھے کب میسر آیا۔ میاں جان کی زندگی میں تو ایک جماؤ تھا۔ پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے۔ پتھر سے زیادہ میاں جان بھاری تھے کہ کس اطمینان اور آسودگی کے ساتھ اپنی ٹھیک پر جمے بیٹھے رہے۔ شہر سے نکلنا تو دور کی بات ہے، ڈیوڑھی سے نکلنے کی بھی کم ہی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بس دو ایسے موقع آتے تھے جب چراغ حویلی سے قدم نکالتے تھے۔ ایک ساون بھادوں کے دنوں میں جب نوروز منانے کی نیت سے خاندانی تام جھام کے ساتھ باغ میں جا کر ڈیرا لگاتے۔ ایک اس وقت جب انگریز کلکٹر دورے پر یہاں آن وارد ہوتا۔ اس موقعہ

پر ببوا کس اہتمام سے تانگہ جوتتا۔ کیا چم چم کرتا تانگہ تھا اور کیا چم خم اس گھوڑے کے تھے۔ بگھی تو پتہ نہیں کس زمانے سے کھٹ بگڑی گرد آلود اندر اصطبل میں کھڑی تھی۔ اب تو اس تانگہ ہی کی بہار تھی کہ جب میاں جان اس میں بیٹھ کر نکلتے تو راہ چلتے لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور اپنی اپنی ٹھیک پر بیٹھے ہوئے دکاندار کھڑے ہو کر سلام کرتے کہ ایک ایک کو پتہ ہوتا کہ خان بہادر صاحب انگریز بہادر سے ملاقات کے لئے ڈاک بنگلہ جا رہے ہیں۔

باقی دنوں میں وہی ایک طور کہ صبح ہی صبح مردانے میں بیٹھ کر عدالت لگانا۔ (آنریری مجسٹریٹ جو تھے۔) دوپہر ہوتے ہوتے عدالت ختم کر کے دسترخوان پر بیٹھنا، اس کے بعد قیلولہ کہ گرمی کے دن ہوئے تو دھوپ ڈھلنے تک خس کی ٹٹیوں سے لیس کمرے میں لمبی جھالر والے پنکھے تلے آرام کرنا، شام پڑے چھڑکاؤ سے شاداب صحن میں برآمد ہونا اور گاؤ تکیے کے سہارے تخت پہ بیٹھنا کہ ان کے آکر بیٹھتے ہی ملاقاتیوں جی حضوریوں کا تانتا بندھ جاتا اور رات گئے تک بندھا رہتا۔ اسی ایک طور پر پوری زندگی چراغ حویلی میں گزار دی۔ وہیں پیدا ہوئے، وہیں سے جنازہ نکلا۔ اب ہم پیدا کہاں ہوتے ہیں، مرتے کہاں جا کر ہیں۔ نال کس کوٹھری میں گڑتی ہے، جنازہ کس ڈیوڑھی سے نکلتا ہے۔ آدمی اب ڈال سے ٹوٹا پتہ ہے کہ ہوا اسے اڑائے اڑائے پھرتی ہے کہاں سے روتی ہے کہاں جا کر ڈھیر کرتی ہے۔

میاں جان چراغ حویلی میں بیٹھے پتھر کی مثال بھاری تھے۔ میں گلی کا روڑا بن گیا۔ یہاں آ کر کتنے مکان بدلے، کس کس محلہ میں جا کر رہا۔ ایک وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے شہر میں وارد ہوتے ہی بلا تکلف کسی متروکہ مکان کا تالا توڑا اور جم کر بیٹھ گئے۔ اپنے پرائے الاٹمنٹ کا پروانہ لے کر آتے، پولیس کی کمک ساتھ لاتے مگر وہ اپنی جگہ جمے بیٹھے ہیں نہ دھمکی دینے والوں سے مرعوب نہ سرکاری نوٹسوں کی پروا۔ بس جس گھر میں براج گئے

سو براج گئے۔ ایک میں تھا کہ آج اس محلہ میں کل اس گلی میں کتنے برسوں تک میں اس شہر میں گلی گلی رُلتا پھرا۔

"بیٹے اخلاق، یہ تم نے ہمیں کہاں جنگل میں لا پھینکا ہے۔ نگوڑی یاں پہ تو اذان کی آواز بھی کان میں نہیں پڑتی" چپ ہونا اور پھر شروع ہو جانا "ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ کہاں کالے کوسوں جا رہے ہو۔ مگر تیرے باپ نے ایسا تلے اُوپر کیا کہ میری عقل پہ پتھر پڑ گئے۔ اے لو وہ تو یاں پہ آتے ہی ٹھنڈے ٹھنڈے چلے گئے ہمیں جنگل ویرانے میں چھوڑ گئے۔ یہ نگوڑی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ میں نے تو یاں پہ کبھی کسی بخت مارے پھیری والے کی بھی آواز نہیں سنی۔ بس سویرے سے شام پڑے تک کوؤں کی کائیں کائیں سنے جاؤ۔ ارے میں تو یاں رہ کے خفقانی ہو جاؤں گی"

بوجان اپنی جگہ سچی تھیں۔ وہ نئی نئی چراغ حویلی سے نکل کر آئی تھیں۔ جہاں سویرے سے رات گئے تک اندر باہر کیسی چہل پہل رہتی تھی کہ اندر زنانے میں بوجان کے ہاتھ میں سروطہ مستقل چلتا رہتا اور باہر مردانے میں گلوریوں کی تھالی مسلسل گردش میں رہتی اور یہاں شام ہوئی اور ہو کا عالم۔ دن میں بھی کونسا شور ہنگامہ ہوتا تھا۔ آخر کس تقریب سے ہوتا۔ آس پاس نہ مکان نہ دکان۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے چند ایک کوٹھیاں ضرور تھیں مگر دور سے یہی لگتا تھا کہ جیسے ان میں کوئی رہتا نہیں۔ ان کوٹھیوں سے پرے ایک بوسیدہ سا پھاٹک نظر آتا تھا جس کے سامنے گرمیوں کے دنوں میں صبح ہی صبح چار چھ ریڑھے کھڑے نظر آتے اور ان پر لدی ہوئی برف کی سلیں۔ اصل میں یہ کوئی برف کا کارخانہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں

دو ریڑھے رخصت ہو جاتے۔ پھر سڑک سنسان یہاں جتنا بھی شور تھا پرندوں کا تھا کہ وہاں کھڑے گھنے درختوں پر دن بھر اُترتے رہتے، بے چین ہو کر اُڑتے رہتے، شور کرتے رہتے۔ کوّے سب سے بڑھ کر فضا پر چھائے نظر آتے۔ درخت بھی تو اس نواح میں کافی تھے۔ کوٹھی تو فاصلہ پر کوئی کوئی نظر آتی تھی۔ زیادہ تو درخت ہی نظر آتے تھے اور موسم کے ساتھ کس طرح بدلتے چلے جاتے تھے۔ کبھی ہرے بھرے کبھی پیلے چھدرے۔ ایک وقت میں اتنے گھنے ہوتے کہ پتہ ہی نہ چلتا کہ ان کی ٹہنیوں کے بیچ پرندوں کی پوری برات اُتری ہوئی ہے۔ پت جھڑ لگنے پر یہی درخت کتنے چھدرے ہوتے چلے جاتے۔ کوئی کوئی تو سارے پتوں سے نجات حاصل کر کے بالکل برہنہ ہو جاتا۔ لگتا کہ خشک ہو گیا۔ مگر بسنت رُت کے ساتھ جہاں اور درختوں پر نئے پتے آتے اُن لنڈ منڈ درختوں کو بھی نئی پوشاک مل جاتی۔ پھر ویسے ہی ہرے بھرے۔ پھر پرندوں کو لپنے چھپنے کے لئے گوشے میسّر آجاتے۔ پھر نئے گھونسلوں کی داغ بیل پڑ جاتی۔ خود اس احاطہ میں جس میں میرا مکان تھا درخت اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ ان میں ایک تو مولسری کا پیڑ تھا۔ جس پر جب موسم آتا تو فضا میں ہر وقت ایک ہلکی مہک بسی رہتی اور ایک پیپل جو بہت پھیلا ہوا تھا۔ میرے لئے تو یہ دو پیڑ ہی بہت تھے۔ اسی لئے میں نے باقی پیڑوں کو جاننے پہچاننے کے لئے زیادہ تردد نہیں کیا۔

اصل میں یہ میرا مکان ایک متروکہ کوٹھی کی انیکسی تھی۔ یہ کوٹھی اپنی سُرخ اینٹوں والی دیواروں کی وجہ سے لال کوٹھی کہلاتی تھی۔ کوٹھی پر کون قابض ہے؟ یہ جاننے کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وقتاً فوقتاً ایک بھاری بھرکم شخص ادھ میلے لباس میں سائیکل پر سوار نکلتا یا داخل ہوتا نظر آتا۔ تعارف اور علیک سلیک کا تکلف نہ اس کی طرف سے ہوا نہ میری طرف سے۔ تعارف اس نے کرایا بھی تو اس اطلاع کے ساتھ کہ پوری کوٹھی اس کے نام الاٹ ہو گئی ہے۔ میں نے بات بڑھائے بغیر فوراً

ہی کرایہ دار کی حیثیت منظور کر لی۔ خوش اسلوبی سے معاملہ طے ہوتے دیکھا ہے تو پھر اُس نے بھی کوئی تقاضا کوئی تکرار نہیں کی۔ مجھے کرایہ دار کی حیثیت میں کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے کوٹھی میں تالا ڈالا اور مجھے اپنا پتہ بتا کر ملتان چلا گیا۔ جہاں اسے ایک پن چکی الاٹ ہو گئی تھی۔ اس کے پتہ نوٹ کرانے پر مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام برکت الٰہی ہے۔ میں برکت الٰہی کو بہت پابندی کے ساتھ مہینے کے مہینے منی آرڈر سے کرایہ بھیجتا رہا۔

شروع میں تو میں بھی یہاں اکھڑا اکھڑا رہا۔ میرے لئے بھی یہ فضا اتنی ہی اجنبی تھی۔ جتنی بوجان کے لئے۔ مگر یہاں کے گرد و نواح اپنے درختوں اور پرندوں کے ساتھ دھیرے دھیرے میرے اندر گھر کرتے چلے گئے۔ سویرے منہ اندھیرے جب میں سیر کے لئے نکلتا تو اس نواح کا اُجڑا اُجڑا پن دل کے کسی گوشے کو چھوتا محسوس ہوتا۔ آثارِ قدیمہ تو اپنی قدامت اور ویرانی کے ساتھ ہم پر کس قسم کا اثر کرتے ہیں۔ جس قسم کا بھی کرتے ہوں۔ بہر حال وہ اثر ہوتا ہے۔ بہت واضح۔ یہاں ایسے اثر آثار نہیں تھے۔ جنہیں آثارِ قدیمہ کے ذیل میں شمار کیا جا سکے۔

ہم پر کس قسم کا اثر کرتے ہیں۔ جس قسم کا بھی کرتے ہوں بہر حال وہ اثر ہوتا ہے۔ بہت واضح۔ یہاں ایسے اثر آثار نہیں تھے۔ جنہیں آثارِ قدیمہ کے ذیل میں شمار کیا جا سکے۔

لے دے کے ایک لمبا چوڑا نشیب تھا۔ جس میں کہیں کہیں نانک شاہی اینٹ کی بنی کوئی سیڑھی ٹوٹی پھوٹی خاک دھول میں اَٹی کچھ ظاہر کچھ گم دکھائی پڑتی۔ ایک صبح میں اپنے اکیلے پن میں مگن ارد گرد پر نظر ڈالتا۔ اُجلے ہوتے منظر کو نظر کے اندر سمیٹتا چلا جا رہا تھا کہ ایک اجنبی نیم کی مسواک کرتا میرے ساتھ لگ لیا۔ صبح کی سیر میں آدمی کے اندر ایک کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی بھی آس پاس ٹہلتے ہوئے آدمی سے بے جانے بوجھے پہلے علیک سلیک ہوتی ہے، پھر موسم پر اکا دکا بات، پھر دنیا جہاں کی باتیں، اور

اتنی گھل مل کر جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ تو اس بھلے مانس نے بھی چلتے چلتے علیک سلیک کی، تھوڑی دُور ساتھ ساتھ چلا اور پھر جانے کس بہانے بات شروع ہوئی اور ایسی شروع ہوئی کہ پھر باتیں ہوتی ہی چلی گئیں۔ میں نے بس یوں ہی اس اجاڑ سوکھے نشیب کے بارے میں کچھ تجسس ظاہر کیا۔ وہ بولا "ایہہ سیتا کنڈ ہے جی"

"سیتا کنڈ؟"

"آہو جی۔ ایس پاسے سیتا مائی اشنان کیا کرتی تھی"

"سیتا مائی؟ آپ کا مطلب سیتا جی سے ہے۔ سیتا جی۔ یہاں کہاں سے آگئیں"

"ایہی تو گل ہے۔ ایس شہر کو تو اہی کے پُتر نے بسایا تھا اور جہاں پوتر وہاں مادر"

اس روایت پر مجھے پوری طرح اعتبار تو نہیں آیا۔ مگر اس سے اس جگہ کے بارے میں تجسس اور بڑھ گیا۔ اب میں نے دل ہی دل میں سنجیدگی سے طے کیا کہ اس نواح کو ذرا تفصیل سے کھوندنا چاہیے۔ سوچا کہ اتوار کی صبح فرصت کی صبح ہوگی کہ وہ چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ بس اس روز یہ پروگرام رہے گا۔ مگر اتوار کے آنے سے پہلے ہی ایسی بات ہوگئی کہ پھر میری توجہ بٹ گئی اور پھر یہاں سے میرا جی اچٹ گیا۔ برکت الٰہی ملتان سے اچانک آن دھمکا۔ "اب جی میں یہیں رہوں گا"

"اچھا؟"

"ہاں جی۔ یاں انارکلی میں مجھے ایک متروکہ دکان الاٹ ہوگئی ہے"

"اور جو ملتان میں پن چکی آپ کو الاٹ ہوئی تھی اس کا کیا بنے گا"

"وہ بھی چلتی رہے گی۔ وہاں میں اپنا ایک کارندہ چھوڑ آیا ہوں"

"چلئے اچھا ہے آپ آگئے۔ اس کوٹھی کی حالت بہت خستہ ہوگئی تھی"

"بس جی اس جگہ کا بھی اب کچھ کرنا ہے" اِدھر اُدھر نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

جھاڑ جھنکاڑ کھڑا ہے۔ سب صاف کرا کے یہاں دکانیں بنوانے لگا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ جگہ کمرشیل ایریا بننے والی ہے۔ اس وقت یہ دکانیں سونا اگلیں گی۔"

"مگر یہ جو درخت کھڑے ہیں۔"

"ان سب کو کٹوا دوں گا۔"

"کیا؟... ان درختوں کو آپ کٹوا دیں گے۔" میں حیران و پریشان اس کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں اور کیا۔ جگہ بیکار کیوں پڑی رہے اور اتنی اچھی جگہ۔"

میں بہت گھبرایا۔ مجھے فوراً ہی مولسری اور پیپل کا خیال آیا جن سے میں اتنا مانوس ہو گیا تھا۔

"مگر یہ مولسری؟"

"ہاں جی، اس مولسری نے بہت جگہ گھیر رکھی ہے۔"

میں پھر اس شخص کا منہ تکنے لگا۔

"مگر یہ پیپل تو بہت پرانا ہے۔"

"ہاں جی بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اسے تو ویسے بھی کٹوا دینا تھا۔ بس کل پرسوں میں انتظام کرتا ہوں۔ جنگل بنا ہوا ہے۔ اسے سارے کو صاف کرا دینا ہے۔"

"اتنی جلدی؟" میں سخت گھبرایا۔

"ہاں جی۔ میں جب فیصلہ کر لوں تو پھر دیر نہیں کیا کرتا۔ پر آپ مت گھبرائیں جی۔ ابھی میں عمارت کو ہاتھ نہیں لگا رہا۔ وہ بعد میں سوچوں گا۔ آپ بے فکر ہو کے رہیں۔ ابھی میں آپ سے اٹھنے کا تقاضا نہیں کروں گا۔"

"نہیں، آپ کو تقاضا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" یہ کہہ کر میں تو چلا آیا۔ وہ درختوں کا دیر تک جائزہ لیتا رہا۔

"اے بیٹے، یہ تم پہ کیا سنک سوار ہوئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ جہاں آ کے بیٹھ گئے ہیں وہاں بیٹھے رہیں۔ کہاں تو چولھا سر پہ اُٹھائے اٹھائے پھریں۔"

بوجان نے رفتہ رفتہ اس فضا سے جسے وہ جنگل ویرانہ بتاتی تھیں سمجھوتہ کر لیا تھا۔ مگر میں اکھڑ چکا تھا۔

"نہیں بوجان، اس گھر میں اب ہم نہیں رہیں گے۔ یہ برکت الٰہی بہت بے برکت آدمی ہے۔"

"بیٹے۔" بوجان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "برکت تو زمانے ہی سے اُٹھ گئی۔ خیر ہمیں اس نحوست مارے سے کیا لینا ہے۔ ہم اپنے کونے میں سر چھپائے بیٹھے ہیں۔"

"بہر حال میں نے گھر کا انتظام کر لیا ہے۔"

"اچھا جیسا تمہاری سمجھ میں آئے۔ میں تو یہ سوچ کے کہہ رہی تھی کہ تمہیں بھی بے آرامی ہوگی اور میری بھی ضعیفی ہے۔ سامان کون سمیٹے گا، کون ڈھوئے گا۔"

"سب ہو جائے گا۔ بس آپ صبح اُٹھ کر مجھے بتاتی جائیں۔ میں سب کر لوں گا۔"

"اے ہے ذرا تو دم لیا ہوتا۔ ہڑبڑ کا کام اچھا نہیں ہوتا۔"

"بوجان، جب یہاں سے اُٹھنا پڑ ہی گیا ہے تو دیر کیوں کی جائے۔"

"اے لڑکے تجھ پہ کوئی بھوت سوار ہے۔"

بس مجھ پہ بھوت ہی سوار تھا۔ بوجان کو کیسے سمجھاتا کہ سویرے سویرے آدمی درخت کاٹنے کے لئے آن پہنچیں گے اور میں اس واردات سے پہلے پہلے یہاں سے

نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں نے رات مشکل سے کاٹی۔ کتنی رات تک کروٹیں بدلتا رہا کہیں پچھلے پہر میں جا کر آنکھ لگی۔ پھر مرغے کی بانگ کے ساتھ آنکھ کھل گئی۔ ایسے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے سویا ہی نہیں تھا۔ منہ پر پانی کے دو چھپاکے مارے اور آستینیں چڑھا کر پائینچے اکسا کر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ سامان تھا ہی کتنا۔ یہ کوئی چراغ حویلی کا کھڑاک تھوڑا ہی تھا۔ گھر کا کھڑاک گھر کے جمنے کے ساتھ ساتھ پھیلتا جاتا ہے۔ ابھی ہم یہاں آ کر جمے کہاں تھے۔ ابھی تو بس بنیادی ضرورت کی چیزیں جمع کی تھیں۔ وہ بھی پوری نہیں تھیں۔ بوجان نے کتنی مرتبہ مجھ سے تقاضا کیا تھا کہ بیٹے اکڑوں بیٹھ کے مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ بیٹھ جاتی ہوں تو اُٹھا نہیں جاتا۔ مجھے ایک پینٹری لا دو اور چکلا بیلن کے لئے میں تم سے کب سے کہہ رہی ہوں۔ وہ تو تمہیں پھنکنی چمٹے کے ساتھ ہی لے آنا چاہیئے تھا۔" لیکن میں نے ابھی تک نہ پینٹری لا کر دی تھی اور نہ چکلا بیلن بس اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہمارا ٹانڈا بانڈا کتنا ہوگا۔ سورج نکلنے تک میں نے سارا سامان باندھ لیا تھا۔

پھر میں نے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لیا۔ صبح کی سیر آج موقوف تھی۔ دل میں کہا کہ کم از کم اپنے ہمسایوں سے تو مل لو کہ آج ان کے ساتھ تمہاری آخری صبح ہے اور ان کی اپنی بھی آخری صبح ہے۔ ملا۔ میں افسردہ تھا۔ ان کے منہ پہ تو کوئی ملال نہیں تھا۔ بلکہ سورج کی پہلی کرن کے چھو جانے سے کچھ مسکراتے بھی نظر آتے تھے۔ سب سے بڑھ کر پیپل اور مولسری دونوں اپنے اسی ہمیشہ کے وقار کے ساتھ کھڑے تھے۔ نہ خوش و خرم نہ آزردہ، بس خاموش تھے۔ خیر اس وقت ہوا بھی تو ایسی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے مولسری کے مہکتے سائے میں کھڑے ہو کر ایک گھڑی سانس لیا۔ ننھے ننھے پھولوں کا جو اس سائے تلے اک بستر بچھا ہوا تھا اس میں سے چند پھول چُنے اور واپس اندر آ گیا۔

بوجان نماز سے فراغت پاکر ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔ جلدی جلدی ناشتہ کیا۔

"اے بیٹا رات تم سوئے بھی تھے؟"

"کیوں بوجان نہ سونے کی کیا بات تھی؟"

"اے بیٹا جب میری آنکھ کھلی ہے تو تم سٹر پٹر کر رہے تھے۔"

"بوجان، آپ کی دیر میں آنکھ کھلی۔ میں مرغے کی پہلی آواز کے ساتھ اٹھ بیٹھا تھا۔"

"ہاں شاید میری آنکھ آج دیر سے کھلی۔" پھر تھوڑا رک کر "اے بیٹا سامان تو تم نے باندھ لیا۔ ڈھونے کا کیا بندوبست کیا۔ اس کباڑ کو کیا سر پہ رکھ کے لے جاؤ گے۔"

"بوجان یاں برف خانے کے سامنے ریڑھے کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے کل دو ریڑھوں کے لئے بات کر لی ہے۔ برف کی باری بھگتا کر ادھر آئیں گے۔ بس آتے ہوں گے۔ تانگہ یہیں کہیں سامنے سے پکڑ لوں گا۔"

ناشتہ جلدی جلدی کیا۔ پھر یہ سوچ کر ریڑھے والے کہیں بھٹکتے نہ پھر رہے ہوں۔ میں باہر نکل گیا۔ درخت کاٹنے والے آدمی اپنی کلہاڑیوں اور آروں کے ساتھ آن پہنچے تھے۔ برکت الٰہی انہیں مستعدی سے ہدایات دے رہا تھا۔

"دیکھئے برکت الٰہی صاحب، میں نے کل آپ کو بتا دیا تھا۔"

"کیا جی؟" وہ میرے درشت لہجہ سے تھوڑا سٹپٹا گیا تھا۔

"میں نے کل آپ سے کہا تھا کہ درخت ہمارے جانے کے بعد کٹیں گے۔"

"ہاں جی۔ مگر آج تو آپ چلے جائیں گے۔ آپ نے کل یہی بتایا تھا۔"

"جی ہاں ہم آج ہی جا رہے ہیں اور ابھی جا رہے ہیں۔ مگر جب تک ہم یہاں سے رخصت نہ ہو جائیں کسی درخت پہ کلہاڑا نہیں چلے گا۔"

"بہت اچھا جی۔" اور وہ فوراً کلہاڑے والوں سے مخاطب ہوا "اے بھئی دیکھو پہلے چائے شائے پی لو۔ اخلاق صاحب چلے جائیں۔ پھر کام شروع ہو گا۔"

کلہاڑے والوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ دیکھتے ہی رہے اور میں جب وہاں سے ہٹ کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف جا رہا تھا تو برکت الٰہی کو میں نے دیکھا کہ کلہاڑے والوں سے کچھ دبی زبان میں کہہ رہا ہے۔ بس مجھے ایک فقرہ سنائی دیا۔ "یہ بابو کچھ سنکی ہے"۔

ریڑھے آگئے تھے۔ ایک تانگہ بھی آن پہنچا تھا۔ ریڑھے والوں کو ساتھ ملا کر میں نے جلدی جلدی سامان ریڑھوں پر لادا۔ تانگہ کی پچھلی نشست پر بوجان کو اُن کی پوتلیوں اور بچے کے ساتھ بٹھا دیا۔ چند چیزیں میں نے ہاتھ میں تھامیں۔ والد صاحب کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

تانگہ چلنے لگا تو کلہاڑے والوں نے کتنے غور سے مجھے دیکھا۔ جب تانگہ کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہا تھا تو دفعتاً کلہاڑا چلنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ کچھ گھبرا کر ایک دم سے میں نے مڑ کر دیکھا۔ بدبختوں نے بسم اللہ مولسری سے کی تھی۔